Date of Publication : 02-07-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 July 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 July 2014
Issue: 26, Vol: 73

۸-۱۴ جولائی ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر ۲۶، جلد نمبر ۷۳

جوش کا خاکہ اور شاہد احمد دہلوی کے قلم سے گویا ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا' شاہد احمد دہلوی اردو کے صاحب طرز نثر نگار تھے اور جوش ملیح آبادی اردو کے بے حد اہم شاعر۔ ہر چند کہ شاہد احمد دہلوی جوش سے کسی قدر بدظن بھی تھے لیکن جوش کی شخصیت پر نثری خاکے کے لیے ان سے موزوں شخصیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حالاں کہ ٹیگور کے سلسلے میں ان کے بیان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، لیکن جوش پر ان کا یہ خاکہ بے حد عمدہ ہے اور اسی لیے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

میرے والد مرحوم کو اردو کی نئی مطبوعات منگانے کا شوق تھا۔ کتابیں اور رسالے چھپتے ہی ان کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔ غالباً ۲۵ یا ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے کہ نئی کتابوں میں ایک کتاب 'روح ادب' بھی آئی تھی۔ یہ کتاب اس زمانے میں شائع ہونے والی کتابوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس کی ہر بات انوکھی تھی۔ بانگ درا کے سائز پر چھپی تھی، جو اس

ٹیگور کو نوبل پرائز ملا تھا اس لیے یہ سمجھ لیا گیا کہ ضرور اس میں کوئی بڑے کام کی بات کہی گئی ہے۔ حالاں کہ آج تک یورپ والوں ہی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ملارمی اور ماترلنک قسم کے شاعر یہ کیا فرما گئے ہیں کہ

ایک دروازہ کھلا
ایک دروازہ بند ہوا اور
ایک بچے کے رونے کی آواز آئی

پہلی قسط

جوش ملیح آبادی

دیدہ وشنیدہ

شاہد احمد دہلوی

زمانے میں بالکل مروج نہیں تھا۔ کتابت وطباعت بڑی دیدہ زیب تھی۔ چند تصویریں بھی اس کتاب میں شامل تھیں۔ 'روح ادب' میں چھوٹے چھوٹے شاعرانہ مضامین تھے۔ شاعرانہ مختصر مضامین لکھنے کا خبط اب سے چالیس سال پہلے ہر ادیب کو تھا بلکہ اسے کمال نثر نگاری سمجھا جاتا تھا کہ ایسی عبارت لکھی جائے جس میں موٹے موٹے عربی فارسی کے الفاظ اور مغلق ترکیبیں ہوں اور اصل بات بہت ذرا سی ہو، بلکہ اگر اصل بات سرے سے اس میں ہوتی ہی نہیں تو اور بھی اچھا۔ اس صورت میں یہ تحریر ادیب کا شاہکار بن جاتی تھی۔ ایسے ہر ادیب کی ہر تحریر شاہکار تصور کی جاتی تھی۔ کتنے ہی ادیب ایسے تھے جو صرف شاہکاری لکھا کرتے تھے۔ اصل میں یہ بیماری گیتانجلی کے ترجمے سے اردو میں پھیلی تھی۔ ٹیگور کی مابعد الطبیعاتی شاعری گویا لوگ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں جست اس کے ترجمے پر اتر آئے۔ چونکہ انھیں یہی معلوم نہ ہو سکا کہ اس پر کہاں سر دھنا چاہیے؟ ٹیگور نے بھی یہی گر استعمال کیا اور بعض نے اسے جھنڈے پر چڑھا دیا۔ اردو کی شامت اعمال، یہ کتاب کہیں سے نیاز فتح پوری کے ہاتھ لگ گئی۔ 'عرض نغمہ' کے نام سے اس کا ترجمہ فوراً تیار ہو گیا۔ نام ہی دیکھ لیجیے 'عرض نغمہ' اس کے اندر جو گت ٹیگور کے شاہکار کی بنی ہے اسے کسی وقت فرصت سے دیکھیے گا تو اس کے جوہر آپ پر کھل جائیں گے۔ ہمارے ادیبوں کے ہاتھ ایک سہل نسخہ لکھنے لکھانے کا آ گیا۔ لگے سب کے سب عرض نغمہ کرنے۔ البتہ اتنا اضافہ ٹیگور پر اور کیا کہ اپنی تحریروں میں بہت سارے آہ۔۔۔ ڈیش اور نقطے اور ڈنڈے (!) جہاں تہاں ڈال دیے تاکہ پڑھنے والے ان ڈیشوں اور ڈنڈوں سے نفس مضمون کی بھول بھلیوں میں سر پھٹول کرتے رہیں۔ پیاز کو چھیلیے، پرت ہی پرت اترتے چلے جائیں گے، مغز آپ کہیں نہیں پائیں گے۔ یہی حال اس نیازی یا پیازی ادب کا تھا جسے 'ادب لطیف' موسوم کیا گیا....

بات میں سے بات نکل آئی
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

ہاں تو ذکر تھا 'روح ادب' کا۔ اس میں جو نثر پارے درج تھے ان کا انداز تحریر روش عام سے یکسر مختلف تھا۔ واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ نثر میں نظمیں لکھی گئی ہیں۔ مصنف کا نام تھا نواب شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی۔ میں نے جوش صاحب کو یہیں سے جانا پہچانا۔ اس کے بعد 'ہمایوں' میں ان کا کلام بالالتزام شائع ہونے لگا اور بعض اور معتبر ادبی رسالوں میں بھی۔ 'ساقی' میں جنوری ۱۹۳۰ء یعنی پہلے ہی پرچے سے جوش صاحب کا کلام آنے لگا۔ ۱۹۳۲ء میں مجھے اپنے منجھلے بھائی بشیر احمد اور دوسرے عزیزوں سے ملنے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے جن ادیبوں اور شاعروں سے حیدرآباد میں ملنا تھا ان کی فہرست خاصی طویل تھی۔ منجھو صاحب پولیس کے آدمی! انھیں تمام سلسلوں کی خبر تھی۔ فہرست دیکھ کر بولے "فرحت اللہ بیگ سے تمھیں حیدر وزیر حسن ملوا دیں گے۔ فانی، جوش اور علی اختر سے کرنل اشرف الحق۔ مولوی عنایت اللہ سے تابش، میں بھی ساتھ چلا چلوں گا۔ تمکین کاظمی تو یہ سامنے اردو مجلس میں روز شام کو آتا ہے اور یہ ناکارہ اور آوارہ اور کون کون ہے، انھیں تھانے میں کیوں نہ بلوا لیا جائے؟" میں نے کہا "مناسب نہیں ہوگا۔ پہلے میں ایک ایک بار سب کے ہاں ہو آؤں"۔ بولے "تو پھر یہ کرتے ہیں کہ تھانے میں نہیں کھانے پر سب کو بلائے لیتے ہیں"۔ میں نے کہا "اسے بھی بعد کے لیے اٹھا رکھو"۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کرنل اشرف الحق باہر ہی سے آوازیں دیتے در آئے "شاہد کہاں ہے، شاہد کہاں ہے؟" میں دوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔ اس وقت مجھ سے عمر میں دگنے تھے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی

تھے۔ چودہ سال ولایت میں رہ کر ایڈنبرا سے ڈاکٹری کی سند لے کر آئے تھے اور قلعہ گولکنڈہ میں افواج باقاعدہ کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ اللہ ان کی روح کو نہ شرمائے، ہر وقت اتنی پیتے تھے کہ مرنے لگتے تھے۔ وہ تو شراب کو کیا چھوڑتے شراب انھیں چھوڑ رہی تھی۔ اچھے ہونے کے بعد مہینوں نہیں پیتے تھے، پھر کوئی دوست پچکار دیتا اور سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔ مگر اتنی پینے پر بھی میں نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی بہکتے یا بدہوش ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ اس قدر عجیب و غریب کردار کے آدمی تھے کہ ان پر ایک علاحدہ مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ہجو اور مغلظات کے شعر کہنے کا بھی خاص ملکہ رکھتے تھے، مگر غزل تو کیا کہرام کہتے تھے۔ عرشی تخلص تھا۔ شعر و شاعری کی وجہ سے حیدرآباد کے تمام شاعروں سے تعلق تھا اور سب کا دم بھی

ان سے لکھا تھا کیوں کہ ذرا سی بات پر فحش ہجو لکھ دیا کرتے تھے اور ستم بالائے ستم یہ کہ خود جاکر اسے سنا بھی دیتے تھے۔ خیر تو ڈاکٹر صاحب سے یہ طے ہوگیا کہ جوش صاحب سے مجھے وہ اگلے دن ملوادیں گے۔ دوسرے دن صبح دس بجے ڈاکٹر صاحب آئے اور مجھے دارالترجمہ لے گئے۔ سب سے پہلے ابوالخیر مودودی سے ملوایا جو ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ دھان پان سے نرم ونازک آدمی تھے مگر ان کے لفظ لفظ سے طبیعت چھلکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ خوش اخلاقی سے کھانے پر مدعو کیا۔ مولانا عمادی سے ملوایا۔ انھوں نے بھی دعوت کی پیش کش کی۔ جوش صاحب سے ملوایا۔ گرم جوشی سے ملے۔ دعوت کا دن مقرر کرلیا۔ باہر نکل کر میں نے کہا "بھائی جان، اگر دعوتیں ایسی فراخ دلی سے منظور کی گئیں تو تمھ صاحب بگڑ جائیں گے"۔ بولے "میں تمھ کو سمجھا لوں گا"۔ اس کے بعد گھڑی دیکھ کر بولے "ابھی دوپہر کے کھانے میں کچھ دیر ہے۔ لگے ہاتھوں علی اختر سے بھی مل لو"۔ میں نے کہا چلیے۔ علی اختر کے گھر پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ لڑکا برآمد ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "ابا ہیں؟" وہ "ہیں" کہہ کر اندر بھاگا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "سنو، ان سے بولو شاہد احمد دہلوی ملنے آئے ہیں"۔ لڑکا میرا نام جانتا تھا، ایک نظر اس نے مجھے دیکھا اور تتری ہوگیا۔ پانچ منٹ گزر گئے واپس نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آج کل علی اختر کے سارے جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آئی ہیں۔ وہ ننگے بیٹھا ہوگا۔ دفتر سے چھٹی لے رکھی ہے۔ بارے لڑکا منہ لٹکائے واپس آیا اور نیچی نظریں کیے بولا "ابا کہیں باہر گئے ہوئے ہیں"۔ جب ہم کار میں واپس آبیٹھے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "گھر ہی میں تھا"۔ میں نے پوچھا "تو ملے کیوں نہیں؟" بولے "کل معلوم ہوجائے گا"۔ اگلے دن ڈاکٹر صاحب علی اختر کے ہاں سے ہوتے ہوئے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ "علی اختر ملے تھے اور بہت شرمندہ تھے کہ کل تم سے نہیں ملے۔ دراصل اس بچارے کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمھاری دعوت کرسکے۔ یہاں کا رواج یہی ہے کہ مہمان کی دعوت ضرور کی جاتی ہے"۔ ان کی اس حرکت پر مجھے غصہ بھی آیا اور ترس بھی آیا کہ محض ایک بیہودہ رواج کے باعث اس دفعہ ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔

جوش صاحب کے ہاں ڈاکٹر صاحب مجھے لے گئے۔ خاصی پرتکلف دعوت تھی۔ دسترخوان پر ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ روتوں کو ہنساتے تھے۔ جوش صاحب شاعر بھی تھے اور بادہ خوار بھی، اس لیے ڈاکٹر صاحب سے ان کی خوب نبھتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی مجھے جوش صاحب کے بہت سارے واقعات معلوم ہوئے، ان میں سے چند آگے بیان ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب عمدہ ولایتی شراب پیا کرتے تھے جوش صاحب بلانوش تھے، جو بھی مل جائے چڑھا جاتے تھے۔ انھیں جب بھی فرصت ملتی شام کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں جا پہنچتے، عمدہ اور مفت کی ملتی تھی اس لیے گلاس پر گلاس چڑھائے چلے جاتے۔ ڈاکٹر صاحب دو تین گلاسوں میں چھک جاتے تھے۔ بوتل یا تو ہفتے میں ایک خرچ ہوتی تھی یا اب تیسرے ہی دن ان کی بیوی کہہ دیتیں کہ آپ شہر جائیں تو اپنی بوتل لیتے آئیں۔ شروع شروع میں تو یہ دھرا اچھا رہا مگر جب مہنگا پڑنے لگا تو ڈاکٹر صاحب کے نتھنے ہرن ہونے لگے۔ ایک دن شہر گئے تو ایک ولایتی بوتل بھی لائے اور دیسی ٹھرے کی بھی۔ ٹھرا دیکھ کر ان کی بیوی چونکیں۔ "جب ٹھرا آپ کو نہیں پچتا تو آپ کیوں لائے ہیں؟ اُس موئے شرابی نے آپ کو بھی ٹھرے پر لگا دیا"۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی متانت سے کہا "یہ ٹھرا اسی موئے شرابی کے لیے ہے"۔ ڈاکٹر صاحب گلاس خود کبھی نہیں بناتے تھے گھر میں بیوی بنا کر دیتی تھیں اور گھر کے باہر ایک ملازم جو ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ اب یہ ہونے لگا کہ جب جوش صاحب آجاتے تو ڈاکٹر صاحب کے آواز لگانے پر ملازم دو گلاس بیگم صاحب سے بنوا کر یا خود بنا کر لاتا اور ٹھرے والا گلاس جوش صاحب کو پکڑا دیتا۔ جوش صاحب کہتے کہ آپ نے بھی دیسی پینی شروع کردی؟ تو ڈاکٹر صاحب کہتے ہاں، مگر یہ دیسی اچھی ہے۔ فریب کا یہ سلسلہ دو دن جاری رہا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ ان کے دل میں کوئی بات رہتی نہیں تھی۔ شاید ہر شرابی کا دل منافقت سے خالی ہوجایا کرتا ہے۔

جب جوش صاحب کے لیے نظام دکن میر عثمان علی خاں نے ملک بدری کا فرمان جاری کیا تو مجھے کسی نے حیدرآباد سے اطلاع دی کہ 'ساقی' میں 'غزل گو سے خطاب' جو نظم جوش کی چھپی ہے اس پر یہ عتاب ہوا ہے۔ ڈیوڑھی کے ایک منہ چڑھے آدمی نے نظام کو سنا دیا کہ حضور پر گستاخی جوش نے آپ کی شان میں کی ہے۔ اُس زمانے میں جریدہ 'شاہی' اور روزنامہ 'رہبر دکن' میں روزانہ میر عثمان علی خاں کی ایک بہ نفسی غزل مع رائے استاد جلیل چھپا کرتی تھی۔ یہ رائے بھی حضرت خود ہی لکھ دیا کرتے تھے کہ "سبحان اللہ! کیا غزل ہوئی ہے"۔ مجھے اطلاع دینے والے نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید ریاست میں 'ساقی' کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا جائے گا، مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ جوش کو چوبیس گھنٹے میں ممالک محروسہ سے نکل جانے کا حکم ملا تھا۔ یہ بارہ ہی گھنٹے میں وہاں سے نکل لیے کہ کہیں تبدیلی اور قید کا دوسرا فرمان جاری نہ ہوجائے۔ 'رہبر دکن' میں روزانہ ذرا ذرا سی بات پر فرمان نکلتے رہتے تھے۔ سبحان اللہ! پڑھنے کے لائق ہوتی تھی عبارت ان فرمانوں کی۔ کاش کوئی انھیں جمع کرکے شائع کردے۔ خوجی اور حاجی بغلول کو آپ بھول جائیں گے۔ خیر یہ ایک الگ کہانی ہے۔ دراصل نظام کے چہیتے شہزادے معظم جاہ کے شبینہ دربار میں جوش کا عمل دخل ضرورت سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اس دربار کے واقعات سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ شرفا کا دربار حرام پور اس کے آگے گرد تھا۔ جوش اس دربار کے حاضر باش تھے۔ میں نے حیدرآباد کے ثقہ راویوں سے سنا ہے کہ معظم جاہ کے اشارے پر کل حاضر باش ننگے ہوکر ناچنے لگتے تھے اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا تھا وہ لکھا نہیں جاسکتا۔ اگر کوئی بھیڑو ذرا نہیں نکو کرتا تو پیش خدمتوں کو حکم ہوتا کہ آپ کو بٹھاؤ۔ وہ اس غریب کو اٹھالے جاتے اور پچھاڑ کر اتنی پلاتے کہ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا، پھر اسے دربار میں برہنہ کرکے پیش کیا جاتا اور اسے اوندھا کرکے جلتی ہوئی موم بتی لگا دی جاتی۔ یہ منظر دیکھ کر سب کے دلوں کے کنول کھل جاتے۔ اور جب وہ ہوش میں آتا تو اس سے کہا جاتا "آئندہ سرکار کے کسی حکم سے سرتابی نہ کرنا"۔ ان تمام بیہودگیوں کی اطلاع عالی جاہ کو پہنچتی رہتی تھی مگر وہ شفقت پدری میں مرے جاتے تھے۔ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتے اس کے حاضر باشوں کی تاک میں لگ جاتے۔ چناں چہ طویلے کی بلا بندر کے سر، جوش پر نزلہ گرانے کو انھیں بہانہ ہاتھ آگیا۔ جوش صاحب حیدرآباد چھوڑنے کے کچھ عرصے بعد دلی آگئے۔

حیدرآباد میں جوش صاحب دارالترجمہ میں ناظر ادبی تھے۔ سنا ہے کہ علامہ اقبال سے کسی بڑے آدمی کے نام تعارفی اور سفارشی خط لے کر حیدرآباد گئے تھے۔ نرا کھرا شاعر سوائے شعر کہنے کے اور کیا کرسکتا ہے؟ مگر اس وقت مہاراجہ کشن پرشاد جیسے علم دوست برسر اقتدار تھے۔ وہ شاعروں کو بھی کہیں نہ کہیں کھپا دیا کرتے تھے۔ چناں چہ فانی کو انھوں نے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا تھا اور یگانہ کو کہیں اضلاع میں سب رجسٹرار رکھوا دیا تھا۔ جوش کو انھوں نے دارالترجمہ کی پول میں دھانس دیا۔ ان کا کام یہ تھا کہ تراجم کی نظر ثانی کیا کریں۔ وہاں وہ کیا کرتے ہوں گے؟ اس کا اندازہ یہاں ترقی اردو بورڈ میں ان کی کارکردگی سے ہوا۔ بورڈ نے اردو کی نایاب اور کم یاب کتابوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کی کتاب 'منتخب الحکایات' کے متعلق بورڈ کے سکریٹری شان الحق حقی صاحب کا ایک مراسلہ میرے نام آیا کہ آپ اس مطبوعہ کتاب میں جو غلطیاں کتابت و طباعت کی وجہ سے داخل ہوگئی ہیں ان کی تصحیح کردیجیے اور کتاب پر آخر میں [illegible] کا مقدمہ لکھ دیجیے۔ پاکستان میں یہ کتاب مجھے کہیں نہیں ملی، لہٰذا دلی سے اس کا ایک نسخہ کسی نہ کسی طرح منگایا اور اُسے ٹھیک ٹھاک کرکے بورڈ کو بھیج دیا۔ ایک مہینہ بعد حقی صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ 'منتخب الحکایات' کا کوئی اور نسخہ ہو تو بورڈ کو بھیج دیجیے۔ بورڈ اس کی قیمت ادا کردے گا۔ میں نے کہا "قیمت تو اس کی چھ آنے یا آٹھ آنے ہی ہے مگر وہ کتاب ملتی کہاں ہے؟ پہلے بھی مشکل سے ملی تھی"۔ معلوم ہوا کہ ناظر ادبی نے نہ صرف میرے مقدمے کی زبان ٹھیک کردی بلکہ اصل کتاب کی زبان بھی ٹھیک کردی اور فقرے کے فقرے اس بری طرح کاٹے ہیں کہ اصل عبارت پڑھی نہیں جاسکتی۔ میں نے کہا "خیر میری زبان تو وہ ٹھیک کرسکتے ہیں مگر جس کی کتابیں پڑھ کر ہم سب نے اردو زبان سیکھی ہے اس کی زبان میں بھی جوش صاحب کو غلطیاں نظر آگئیں۔ ذرا مجھے اصلاح شدہ نسخہ بھیج دیجیے تاکہ میں بھی جوش صاحب کے افادات سے محروم نہ رہوں"۔ حقی صاحب بردبار آدمی ہیں، انھوں نے بہ لطائف الحیل اس قضیے کو ٹالا اور میں نے دلی سے ایک اور نسخہ مہیا کرکے انھیں بھیجا۔ دارالترجمہ کے ناظم مولوی عنایت اللہ مرحوم بڑے مرنجان مرنج آدمی تھے، ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ جوش صاحب سے خوش نہیں تھے، جب کام کرنے کا یہ اسلوب ہو تو کوئی خوش ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

دلی آنے کے بعد جوش صاحب نے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ جو ادبی ماہنامے شائع ہو رہے ہیں ان کی کیا حالت ہے اور انھیں کیسے چلایا جارہا ہے۔ یار لوگوں نے ورغلایا اور جوش صاحب چڑھ گئے سولی پر۔ دریا گنج میں ایک مکان کرایے پر لیا گیا اور بڑی بیٹھک کے کمرے میں دفتر کے لیے ایک بالاخانہ کروفر سے سجایا گیا۔ ایک دفعہ مجھے بھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جوش صاحب کو داد واہ کرنے والے گھیرے رہتے۔ دن بھر چائے، شربت، پان، سگریٹ سے تواضع ہوتی۔ ادھر سورج غروب ہوا اُدھر جوش صاحب پینے بیٹھے۔ مفت خوروں کو بھی چسکی لگانے کا موقع ملا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہ شغل رہا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھر سدھارے۔ ادبی رسالے کہیں ایسی شاہ خرچیوں سے چلتے ہیں؟ چند مہینے بعد دفتر چھوڑنا پڑا۔ گھر ہی میں دفتر بھی چلا گیا۔ پرچہ چلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جوش صاحب کو یہ مغالطہ تھا کہ جیسی اچھی وہ نظم لکھتے ہیں اتنی ہی اچھی نثر بھی لکھتے ہیں۔ ایک نیا مضمون نگار اسرائیل احمد خاں انھوں نے خدا جانے کہاں سے تلاش کرکے نکالا تھا۔ وہ اینڈے بینڈے مضامین لکھا کرتا تھا۔ یہ زمانہ تھا 'ہمایوں'، 'ادبی دنیا'، 'نیرنگ خیال'، 'عالمگیر' اور 'ساقی' کے شباب کا۔ جوش صاحب نے محسوس کرلیا کہ پبلک بڑی ناقدر شناس ہے، وہ نسل بھی مستقبل بعید میں پیدا ہوگی جو ان کے رسالے 'کلیم' کی صحیح قدردانی کرسکے گی۔ رسالہ بند کرنے کے بعد انھوں نے ایک مقامی پبلشر سے اپنی کتابیں چھپوانے کا معاملہ کیا۔ چندے ان کی رائلٹی پر گزارہ ہوا۔ پھر یہ سنا کہ ملیح آباد کی طرف ان کا کوئی بہت بڑا زمیندار عزیز مر رہا ہے یا مرگیا ہے اور اس کی پوری املاک کے وارث جوش صاحب ہی ہیں۔ اب انھیں کئی کروڑ روپیہ ملنے والا ہے اس لیے وہ دلی سے چلے گئے ہیں۔ یہ سننے میں آج تک نہیں آیا کہ انھیں وہاں سے کیا ملا۔ {باقی آئندہ}

تیسری اور آخری قسط

اردو شاعری کے کچھ مشہور گھرانے

محمد ایوب واقفؔ (سی کوین اپارٹمنٹ – بی، فلیٹ نمبر ۵۰۷، ساتویں منزل، سیکٹر ۱۲، کوپر کھیرانے، نئی ممبئی – ۴۰۰۷۰۹)

حاجی عبداللہ بیدلؔ بیکانیری کی تیسری پشت میں حاجی خورشید احمد اور محمد یونس خادم شامل ہیں۔ حاجی خورشید احمد صاحب کی یہ علمی و ادبی خدمات کچھ کم نہیں کہ انھوں نے اپنے دادا حاجی عبداللہ بیدلؔ اور والد حاجی راسخؔ بیکانیری کے منتشر اور بکھرے ہوئے کلام کو سلیقے سے یکجا کیا اور پھر انھیں کتابی شکل میں شائع کرکے دنیائے علم و ادب کے سامنے پیش کیا۔ ان کے اس کام کو بہ نظر استحسان دیکھا جانا چاہیے۔ خورشید احمد صاحب نے اپنے ادبی ادارہ حلقۂ ادب کی جانب سے ایک ادبی جریدہ ’کالا صحرا‘ کے نام سے بیکانیر جیسی سنگلاخ زمین سے جاری کیا۔ ان کے اس اقدام کو بھی ہم ان کی اعلا ظرفی اور ان کی ادبی خدمت کا بیّن ثبوت مانتے ہیں۔ ان کے بھائی محمد یونس خادم کو بھی شعر گوئی کا ملکہ حاصل تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم ان کی شاعری کے نمونے نہیں دے پائیں گے۔

اردو شاعری کے مشہور گھرانوں میں علامہ آرزوؔ لکھنوی کا گھرانا بھی شامل ہے۔ آرزوؔ لکھنوی کا خاندانی نام سید انور حسین تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۷۳ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ آرزوؔ لکھنوی کی شعری صلاحیت اپنے آپ میں بے نظیر تھی۔ ان پر اردو کے نغز گو اور ہمہ گیر شاعر جلالؔ لکھنوی نے اصلاح کا فریضہ انجام دے کر ان کی شاعرانہ اڑان کو اور بھی قوت فراہم کر دی۔ آرزوؔ لکھنوی بنیادی طور پر تو غزل ہی کے شاعر تھے لیکن وقتاً فوقتاً انھوں نے مرثیے، قصیدے اور مثنویاں بھی لکھیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں ’فغانِ آرزو‘، ’جہانِ آرزو‘ اور ’نشانِ آرزو‘ بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ آرزوؔ لکھنوی کا فلمی صنعت سے بھی کافی گہرا اور طویل تعلق تھا۔ انھوں نے بہت سی فلموں کے لیے یادگار گیت لکھے۔ انھوں نے اپنی اردو کی خدمت کو کئی اعتبار سے ہمہ جہت بنایا۔ اس سلسلے میں ان کا ایک شعری مجموعہ ’سریلی بانسری‘ خاص اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔

اس شعری مجموعے میں انھوں نے اپنی ایسی شاعری کو پیش کیا ہے جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ شامل نہیں ہیں۔ اپنی اس شاعری کو انھوں نے ’خالص اردو‘ کا نام دیا ہے۔ آیئے ان کے اس خالص اردو کے شعری مجموعے سے ایک غزل پر نظر ڈالیں اور پھر اپنی گفتگو کو آگے بڑھائیں۔

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
پھیلتی دھوپ کا ہے روپ لڑکپن کی اٹھان
دوپہر ڈھلتے ہی اترے گا یہ چڑھتا پانی
روئیں پھوٹے کہ پسینے میں جلن اب کیوں ہو
آگ پگھلا کے نکالا ہے یہ جلتا پانی
کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی امنگ
جی بہا لے گیا برسات کا پہلا پانی
یہ پسینہ وہی آنسو ہیں جو پی جاتے تھے ہم
آرزوؔ لو وہ کھلا بھید وہ پھوٹا پانی

آرزوؔ لکھنوی مرحوم کی ایک کتاب کا نام ’نظامِ اردو‘ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو کی ساخت اور الفاظ کے صحیح اور مناسب استعمال سے بحث کی ہے۔ جو حضرات اردو کے لسانی مطالعے پر زور دیتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتی ہے۔ آرزوؔ صاحب کا انتقال ۱۹۵۱ء میں کراچی میں ہوا۔

سید انور حسین آرزوؔ لکھنوی کے دو بیٹے تنویرؔ کاظمی اور منیرؔ کاظمی ہوئے، دونوں نے شعر و شاعری سے رشتہ استوار کیا لیکن جہاں تک شہرت اور مقبولیت کا تعلق ہے وہ منیرؔ کاظمی (لکھنوی) کے حصے میں زیادہ آئی۔ منیرؔ لکھنوی نے اپنے خاندان کا وسیع و عریض شعری ماحول پایا اور اس سے خوب خوب استفادہ کیا لیکن ان کی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں ان کی بصیرتِ فن کا بہت بڑا دخل تھا۔ منیر حسن کاظمی زبان اور رموزِ زبان سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے لائق و فائق بیٹے ضمیرؔ کاظمی نے ’عکسِ آرزو‘ کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع کیا۔ ان کے کچھ نمونہ اشعار ان کے اس شعری مجموعے سے پیش کیے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

لوگ ناحق کسی مجبور کو کہتے ہیں برا
آدمی اچھے ہیں سب وقت برا ہوتا ہے

میرے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھر کے صنم
آج بت خانوں میں بھگوان بنے بیٹھے ہیں

نہ پوچھو آدمی پر کیا گزرتی ہے مصیبت میں
کھلونا بن کے رہ جاتا ہے جب مجبور ہوتا ہے

حسن اور عشق بہت روئے گلے مل کے
جانے کیا کہہ دیا دیوانے نے دیوانے سے

خدا شاہد ہے حضرت آدم تھے معصوم تھیں ملائک سے
فرشتہ بن گیا انسان آ کر کس کی صحبت میں

منیر حسن کاظمی نے بھی اپنے والد سید انور حسین آرزوؔ لکھنوی کی طرح فلمی صنعت سے وابستگی اختیار کی۔ ان کا انتقال ۱۹۸۵ء میں ہوا۔

آرزوؔ لکھنوی کے پوتے اور منیر حسن کاظمی کے بیٹے ضمیرؔ کاظمی بھی منفرد رنگ و ڈھنگ کے شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں کلکتہ میں ہوئی۔ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کلکتہ میں ہی ہوئی بعد ازاں وہ ممبئی چلے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ شاعری انھیں ورثے میں ملی ہے لیکن صرف اسی ورثے پر وہ قانع نہیں رہے بلکہ اپنے گہرے مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے انھوں نے اس ورثے میں بھرپور اضافہ کیا۔ اپنے دادا اور والد کی طرح ضمیرؔ کاظمی صاحب کو زبان و بیان کا جامع شعور حاصل ہے اسی لیے وہ اپنی ہر بات کو اشعار کے قالب میں بہتر طور پر ڈھالنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے ’مافی الضمیر‘ اور ’آشوبِ دیدہ‘ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ضمیرؔ کاظمی کے یہ دونوں ہی شعری مجموعے اردو کے سرمایۂ سخن میں خوب صورت اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں، یہ اشعار تغزل کی خوشبو سے مہک رہے ہیں:

یہ دریا ہے یہاں ہر کشتی بھی بھیک لیتے ہیں
مسافر تھک کے سوتے ہیں مگر دریا جاگتے رہتا

غزل کی جھلکی تہذیبوں پہ کچھ آئینہ داری کی کرن
خوشی کا پل کہ غم کا موسم مہک رہی ہیں ساعتیں بھی

دنیا کے بازار میں اپنے خوابوں کا کیا مول
ہر سکّہ ہے چاند برابر سونے غیر کرے

مری کائنات کی رمز ہے نئے مہر و ماہ کی جستجو
جو جہانِ طہارِ شعور ہے اسی کہکشاں کا پتا ہوں میں

تمام شب کی تھکن چھوڑ دی ہے آنکھوں میں
سحر ہوئی بھی تو دروازے بند کروں گا

ضمیرؔ کاظمی صاحب اپنے دادا اور اپنے والد کی طرح فلموں کے لیے نغمے بھی لکھتے رہے ہیں، اب تک وہ کئی فلموں میں گیت لکھ چکے ہیں۔ ابھی وہ حیات ہیں، ان سے ہم امید کرتے ہیں کہ ابھی ان کے قلم سے کچھ اور ادبی خدمت انجام پائے گی۔

ہندوستان کی تمام زبانوں میں یہ فخر و امتیاز صرف اردو کو حاصل ہے کہ اس کی بزم میں مسلمانوں کے شانہ بہ شانہ ہندو بھی شامل رہے ہیں اور اس کی یہ خصوصیت ہر عہد میں اردو کے ساتھ پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہی ہے۔ اگر صرف شاعری کی بات کی جائے تو منشی ہرگوپال تفتہؔ، درگا سہائے سرورؔ، برج نرائن چکبستؔ، پنڈت لبھو رام جوشؔ ملسیانی، تلوک چند محرومؔ، فراقؔ گورکھپوری، آنند نرائن ملاؔ اور جگن ناتھ آزادؔ وغیرہ اردو کے مسلمان شعرا سے کم تر درجے کے نہیں تھے۔ ایک بات یہ بھی وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان کی تشکیل و ترقی کے سلسلے میں بھی ہندوؤں کی خدمات لائقِ صد احترام ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ جس طرح اردو کے بہت سے مسلم گھرانے شعر و شاعری کے سلسلے میں مشہور ہیں اسی طرح ہندوؤں کے بھی بہت سے گھرانے ہیں جن میں اردو شاعری نے کئی پشتوں تک پرورش پائی ہے۔ ایسے منفرد اور نامور گھرانوں میں دلّی کے مشہور اور بین الاقوامی حیثیت کے مالک شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزارؔ دہلوی کا گھرانا بھی ہے۔ گلزارؔ دہلوی کے خانوادے میں کئی پشتوں تک اردو شاعری کی شمع روشن رہی ہے۔ گلزارؔ دہلوی صاحب کے والد پروفیسر تربھون ناتھ زتشی زارؔ دہلوی اپنے وقت کے چوٹی کے شاعر تھے۔ ان کا شمار فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی کے قریبی اور چہیتے تلامذہ میں ہوتا تھا۔ انھوں نے دلّی اور بیرونِ دلّی کے بہت سے چوٹی کے مشاعرے پڑھے اور کامیاب رہے۔ اردو کے ادبی حلقوں میں زارؔ دہلوی صاحب کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے سابق جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے سوانحی خاکوں پر مشتمل ایک کتاب ’مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا‘ شائع کی ہے، اس کتاب میں ڈاکٹر خلیق انجم نے پروفیسر تربھون ناتھ زتشی زارؔ دہلوی کا خاکہ بھی تفصیل سے لکھا ہے، اس خاکے کو پڑھنے سے صاحبِ خاکہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

گلزارؔ دہلوی صاحب کی والدہ بھی شاعرہ تھیں۔ اردو کی شاعرات میں بیزارؔ دہلوی کے نام سے وہ مشہور تھیں۔ ان کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کا منتخب کلام ’تذکرۂ شاعرات‘ نامی کتاب میں شامل ہے۔ اب یہ تذکرہ دستیاب نہیں ہے اگر اسے دوبارہ شائع کر دیا جائے تو اس مخصوص عہد کی بہت سی شاعرات کے بارے میں آج کے لوگوں کو معلومات حاصل ہو جائیں۔ گلزارؔ صاحب کے ماموں پنڈت کرودھاری موہن کول بھی شاعری کرتے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

اردو دُنیا

اردو والوں کے ساتھ ہو رہی ناانصافیوں کے خلاف ناراضگی

اردو اسسٹنٹ ٹرانسلیٹرز کے 96 عہدوں پر اردو امیدواروں کا ہی تقرر کیا جائے

بار ایچپا، بہار (۱۰ جون)۔ حسب روایت افسروں نے اردو کے حقوق پر شب خون مارنے کی منظم سازش کی ہے جس پر اردو عوام نے اپنے شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے اور وزیر اقلیتی فلاح و بہبود نوشاد عالم سے کارروائی کی گزارش کی ہے۔ اس سلسلے میں مدرسہ مصباح العلوم میں ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں اردو کی اہم اور سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ میٹنگ کی صدارت مولانا محمد مہتاب قاسمی نے کی۔ موصوف نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ بہار اسٹاف سلیکشن کمیشن کے ذریعے مختلف عہدوں کے لیے بحالی کی درخواست دینے کا آغاز ۱۹ جون سے ہوگا۔ اس سلسلے میں کمیشن نے عہدوں کی تفصیلات فراہم کی ہیں جس کے مطابق اسسٹنٹ اردو ٹرانسلیٹرز کے کل 96 عہدوں کی بحالی ہوگی لیکن قابل غور یہ ہے کہ 96 عہدوں میں سے 55 عہدے ایس سی کے لیے مختص کر دیے گئے ہیں جو اس عہدے کے قابل امیدواروں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے، کیوں کہ ایس سی زمرے میں اردو امیدواروں کا ملنا محال ہے اور اسی کے پیش نظر متعصب افسران نے 55 عہدوں کو مختص کر دیا ہے۔

انجمن ترقی اردو ترہت کے سکریٹری شکیل شاغل نے کہا کہ 96 عہدوں میں سے 55 عہدوں کو ایس سی کے لیے مختص کرنا قابل افسوس ہے اور اس پر فوری کارروائی کی ضرورت ہے۔ شرکا نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کر کے وزیر اقلیتی فلاح نوشاد عالم سے اس سلسلے میں فوری کارروائی کی گزارش کی اور کہا کہ اردو اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر کے کل 96 عہدوں کو صرف اردو داں طبقے میں ہی تقسیم کیا جائے اور ایس سی کے 55 عہدوں کو دوسرے زمرے میں منتقل کر کے فوراً ضمیمہ شائع کیا جائے تاکہ اردو والوں کی بے چینی ختم ہو۔

میٹنگ کے شرکا میں پروفیسر عبدالستار رحمانی، جناب شکیل شاغل، مولانا محمد سراج ندوی، جناب محمد شہاب عالم، جناب مہدی حسن انصاری، جناب ارمان علی، حکیم جمیل اختر اور جناب وسیم اختر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

مغربی بنگال کے اردو اسکولوں میں نصابی کتابوں کا فقدان

کلکتہ (۱۰ جون)۔ مغربی بنگال میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنے کے باوجود اردو ذریعہ تعلیم کی راہ آسان نہیں ہے۔ بروقت کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیمی نظام خراب ہو چکا ہے اور اردو آبادی کے لحاظ سے کالجوں میں اردو کا شعبہ نہیں ہونے کی وجہ سے اردو میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کرنے والے طلبہ در در کی ٹھوکر کھانے پر مجبور ہیں۔ مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں اہم رول ادا کرنے والے ہیومن رائٹس پروٹیکشن ایسوسی ایشن کے صدر جناب شمیم احمد نے اس صورت حال پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ وہ جلد ہی وزیر تعلیم اور وزیر اعلا ممتا بنرجی کو میمورنڈم دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ بنگال میں اردو کے طلبہ کو کافی مشکلات کا سامنا ہے۔ پانچ مہینے گزرنے کے باوجود اردو اسکولوں میں نصابی کتابیں دستیاب نہیں ہوئی ہیں ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے اردو اسکولوں میں تعلیمی نظام معطل ہے دوسرے یہ کہ اردو علاقوں میں قائم کالجوں میں اردو کے شعبے نہ ہونے کی وجہ سے اردو کے طلبہ کو کئی مسائل کا سامنا ہے۔ شمیم احمد صاحب نے کہا کہ ہگلی ضلع میں اردو بولنے والوں کی بڑی آبادی ہے مگر پورے ضلع میں ایک ہی کالج میں اردو کا شعبہ ہے۔ اس کی وجہ سے اردو میں گریجویٹ کرنے والوں کو در در کی ٹھوکر کھانی پڑ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزیر اعلا ممتا بنرجی اردو نواز ہیں اور وہ اردو والوں کے ساتھ انصاف بھی کرنا چاہتی ہیں مگر بنگال کی افسر شاہی نے اس راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے اردو نصاب کی کتابیں اردو اکیڈمی شائع کرتی تھی مگر اب یہ ذمہ داری حکومت نے لے لی ہے۔ اس کی وجہ سے کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ شمیم احمد نے ممتا بنرجی کے کابینہ میں شامل مسلم وزرا اور مسلم ممبران پارلیمنٹ سے بھی اپیل کی ہے کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کریں۔ خیال رہے کہ ۲۰۱۱ء میں ممتا بنرجی نے اقتدار سنبھالتے ہی ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ ۲۰۱۲ء میں اسمبلی میں لنگویج ایکٹ میں تبدیلی کر کے جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی آبادی دس فیصد ہے وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا بل پاس کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اردو کی ترویج کے لیے اردو اکیڈمی کے بجٹ میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا۔ مگر ممتا بنرجی کے ان اقدام کے باوجود اردو آبادی کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو میڈیم مدارس کے مسائل کے حل کے لیے وزیر تعلیم سے نمائندگی کا تیقن

جگتیال، آندھرا پردیش (۹ جون)۔ محمد ریاض الدین (صدر سوا) کی قیادت میں اساتذہ کا ایک وفد رکن اسمبلی جگتیال جناب ٹی جیون ریڈی کی رہائش گاہ پہنچ کر سرکاری اردو میڈیم مدارس میں ودیا والینٹرس کے تقرر اور خالی اسامیوں پر اساتذہ کی بھرتی کے لیے نمائندگی کی جس پر رکن اسمبلی نے ڈی ای او کریم نگر جناب نگیا سے بروقت فون پر بات کی۔ ڈی ای او نے رکن اسمبلی کو بتایا کہ خالی اسامیوں اور ودیا والینٹرس کے تقرر سے متعلق حکومت کو سفارش بھیجی ہے۔ احکام کی اجرائی کے ساتھ ہی انھوں نے ودیا والینٹرس کے تقرر کا تیقن دیا۔ رکن اسمبلی جناب ٹی جیون ریڈی نے اساتذہ کو تیقن دیا کہ اسمبلی کے آغاز کے بعد وزیر تعلیم سے ملاقات کر کے ضلع کریم نگر کے اردو میڈیم مدارس میں اساتذہ کی خالی اسامیوں اور ودیا والینٹرس کے تقرر سے متعلق نمائندگی کریں گے۔ اس موقع پر اساتذہ شیخ نسیم احمد، سرور بیابانی، مرزا مصطفی علی بیگ کمال، محمد سمیع الدین، محمد افضل، خواجہ ریاض الدین کے علاوہ خواجہ نصیر الدین اسعد، محمد ضمیر الدین صنا اور ودیا والینٹرس موجود تھے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اعظم گڑھ شاخ کا قیام

اعظم گڑھ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی کی تحریک اور ایما پر ۱۸ جون ۲۰۱۴ء کو اعظم گڑھ میں محبان اردو کی ایک نشست منعقد ہوئی جس میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی اعظم گڑھ شاخ کا قیام عمل میں آیا اور متفقہ طور پر درج ذیل عہدیداران اور ارکان منتخب ہوئے:

سرپرست: مولانا عمیر الصدیق ندوی

صدر: ڈاکٹر شباب الدین

نائب صدور: مولانا کلیم صفات اصلاحی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

سکریٹری: ڈاکٹر علاء الدین خاں

نائب سکریٹری: ڈاکٹر شفیق احمد اعظمی

خازن: ڈاکٹر محی الدین آزاد

ارکان: مولانا زبیر احمد خاور صدیقی، ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری، جناب جمیل احمد، جناب سرفراز نواز، ڈاکٹر احسان احمد، جناب شریف احمد، جناب ابوسعد فلاحی، جناب محمد ناظم، جناب ابوراشد، جناب حبیب الرحمن نعمانی، ڈاکٹر مرزا ندیم بیگ، ڈاکٹر نعیم احمد اعظمی، جناب عبدالعظیم، جناب نسیم احمد اور جناب عامر نعیم

تلنگانہ کے یوم تاسیس پروگرام میں اردو کو نظر انداز کرنے پر ناراضگی

نظام آباد، تلنگانہ (۱۸ جون)۔ تلنگانہ کے قیام کے موقعے پر سرکاری طور پر منعقدہ یوم تاسیس تلنگانہ کے پروگرام میں اردو کو نظر انداز کرنے اور اردو زبان کے ساتھ سوتیلا سلوک کیے جانے پر ضلع کے اردو داں طبقے کی جانب سے ناراضگی ظاہر کی جا رہی ہے۔ انتخابات سے قبل ٹی آر ایس نے اقتدار میں آنے کے بعد اردو کے ساتھ مکمل انصاف کرنے کا واضح طور پر یقین دلایا تھا اور اردو زبان کے فروغ کے لیے اقدام کرنے کا دعویٰ کیا تھا لیکن دیگر حکومتوں کی طرح ٹی آر ایس نے بھی اقتدار پر آتے ہی اردو کے ساتھ ناانصافی کا آغاز کر دیا۔ اردو داں طبقے نے ٹی آر ایس کے سربراہ پر اسی لیے بھروسہ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی تقاریر میں اردو کے اشعار کا استعمال اور دوران تقریر اردو میں تقریر کرتے ہوئے اردو داں طبقے کو خوش کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ریاستی گورنر کی جانب سے یوم تاسیس سے قبل ضلع کلکٹر کو احکام جاری کرتے ہوئے ۲ جون سے ۸ جون تک تلنگانہ کی یوم تاسیس تقاریب منانے کی ہدایت دی گئی تھی اور اس پروگرام میں اردو کے پروگرام کو بھی شامل کیا گیا تھا جس میں مشاعرہ، قوالی اور دیگر کلچرل پروگرام شامل تھے لیکن ضلع انتظامیہ کی جانب سے صرف مشاعرے کے پروگرام کو انجام دیا گیا اور اس پروگرام میں بھی اردو کے بینر کے بجائے تلگو کے بینر نصب کرنے پر اردو والوں نے اپنی ناراضگی ظاہر کی تھی لیکن اس کے باوجود بھی ضلع انتظامیہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اگر ٹی آر ایس حکومت میں بھی اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک اسی طرح جاری رہا تو اردو والوں کو احتجاج کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

بارک پور میں اردو کالج قائم کیا جائے

بارک پور، مغربی بنگال (۱۹رجون)۔ اس سال کالجوں میں داخلے کے لیے کافی مشکلات کا سامنا طلبہ کو کرنا پڑ رہا ہے۔ بارکپور کے سب ڈویژنل علاقہ ہگلی کے قریبی شہروں کے طلبہ کو اپنے علاقے سے دور کالجوں کی طرف رخ کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے شہر میں کم ایسے کالج ہیں جہاں اردو کا شعبہ ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اردو طلبہ ایسے ہیں جو اپنے سبجیکٹ کے مطابق آنرس لینا چاہتے ہیں لیکن انھیں اپنے علاقے یا شہر کے کالجوں میں داخلہ نہیں مل رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب اردو والوں کے لیے ایک بھی اردو کالج کا نہ ہونا ہے۔ زیادہ تر کالجوں میں اردو کا شعبہ نہیں ہے۔ اگر چند کالجوں میں اردو کا شعبہ ہے بھی تو ان میں سیٹیں بہت ہی محدود ہیں جس کے نتیجے میں اردو والوں کو ضرورت کے مطابق داخلہ نہیں مل پاتا ہے۔ سب سے زیادہ دقت تو ان اردو طلبہ کو ہوتی ہے جو سائنس، کامرس کے تحت پڑھنا چاہتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی طالب علم جغرافیہ، اکنومکس وغیرہ میں آنرس کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس قدر مارکس طلب کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے لائق نہیں ہوتے، اگر اردو میڈیم کالج ہوتا تو ایسے دشوار کن مرحلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

مغربی بنگال میں کئی جگہوں پر ریاستی حکومت کے ذریعے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کا اعلان کیے جانے کے باوجود اردو والوں کو تعلیمی میدان میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایسی حالت میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا کیا معنی کہ اردو والے تعلیم حاصل کرنے کے لائق نہیں رہیں گے اور انہیں دوسرے میڈیم کے کالجوں کے سہارے ہی تعلیم حاصل کرنا ہوگا۔ ممتا حکومت نے ریاست کے مختلف علاقوں میں کئی نئے کالج اور یونیورسٹی قائم کرنے کا اعلان کیا اور کئی جگہوں پر قائم بھی ہو گئے ہیں، لیکن پوری ریاست میں ایک بھی اردو کالج قائم کرنے کا اب تک ممتا حکومت کی جانب سے عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ جب تک اردو کالج قائم نہیں ہوگا اردو والوں کا تعلیمی مسئلہ بھی حل نہیں ہوگا۔ ہر سال ہی کالجوں میں داخلے کا مسئلہ پیدا ہوتا رہے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ اردو کالج قائم کرے۔ اس سلسلے میں ممتا حکومت میں شامل مسلم وزرا، مسلم لیڈروں کو چاہیے کہ وہ اس جانب ممتا حکومت کی توجہ مبذول کرائیں۔ جب تک اردو کالج قائم نہیں ہوگا اردو والوں کو اردو شعبہ والے کالجوں پر ہی انحصار کرنا پڑے گا۔ ریاست میں اردو شعبہ والے کالجوں کی تعداد بھی بہت ہی کم ہے۔ بارکپور میں عالم بازار سے نئی ہٹی تک کل ۸ کالج ہیں، ان میں سے صرف ۳ کالجوں میں اردو کا شعبہ قائم ہے۔ سب سے پہلے مارکسی دور حکومت میں کرہٹی کے ایم ایل اے مانس مکھرجی کی کوشش سے بھیرب گنگولی کالج میں اردو کا شعبہ قائم کیا گیا۔ آج وہاں اردو ایم اے کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ ممتا حکومت کے دور میں دو سال قبل دکھنیشور میں ہیرالال کالج میں اردو کا شعبہ قائم کیا گیا اور اس سال سریندر ناتھ کالج میں اردو کا شعبہ قائم کیا گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عالم بازار سے نئی ہٹی تک اردو طلبہ کے لیے اعلا تعلیم حاصل کرنا کتنا مشکل ہے۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

کرنول میں اردو میڈیم جونیر کالجوں کے قیام کی ضرورت

کرنول، آندھرا پردیش۔ ضلع کرنول کو تین ریونیو ڈویژنس میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ضلع کرنول میں موجود ادونی ڈویژن کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے، یہاں پانچ اسمبلی حلقہ جات ہیں لیکن دو اسمبلی حلقوں میں ہی مسلم طلبہ کے لیے اردو ہائی اسکولس موجود ہیں۔ یہاں سے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں طلبہ دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کر کے ترک تعلیم کر دیتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ طلبہ دسویں جماعت کے بعد اعلا تعلیم کے لیے اردو میڈیم جونیر کالج کے نہ ہونے پر اپنی تعلیم کو ترک کر دیتے ہیں۔ جن سرپرستوں کی معاشی حالت اچھی ہوتی ہے ان کے بچے 75 کلومیٹر کی دوری پر موجود شہر کرنول میں خانگی کالجوں میں زیر تعلیم ہیں۔ بہت سے طلبہ دوری کی وجہ سے کرنول جا کر تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ افسوس کی بات ہے کہ پانچ اسمبلی حلقوں میں ایک بھی اردو جونیر کالج نہیں ہے حالاں کہ صرف بکور ٹاؤن میں 30 ہزار سے زائد مسلم آبادی ہے، مگر اپنے قوم کے نوجوانوں کی زندگی کی کوئی فکر نہیں ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ہردوئی کے ڈگری کالجوں میں اردو سے گریجویشن کی سہولت نہیں

ہردوئی، یوپی (۱۵رجون)۔ شہر میں قائم تین اہم ڈگری کالجوں میں سے کسی میں بھی اردو زبان سے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کرنے کا نظم نہیں ہے، نتیجتاً اردو تعلیم حاصل کرنے کے خواہاں طلبہ کو مایوسی کا شکار ہونا پڑ رہا ہے۔ بعض علاقوں کو چھوڑ دیں تو دیہی علاقوں کے ڈگری کالجوں میں بھی اردو زبان سے بی اے اور ایم اے کرنے کا نظم نہیں ہے۔ شاہ آباد، بلگرام اور پہانی کے ایک ایک ڈگری کالج میں اردو زبان سے بی اے کرنے کا نظم ہے، لیکن سنڈیلہ جیسے مسلم اکثریتی علاقے کے کسی بھی ڈگری کالج میں اردو کے ساتھ گریجویشن کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پا رہا ہے۔ محبان اردو نے صدائیں بلند کرتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت و انتظامیہ سے زیادہ کالج کے سربراہوں کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔

واضح ہو کہ شہر میں سی ایس این پی جی کالج، مہاراجہ پرتاپ ڈگری کالج اور آریہ کنیا ڈگری کالج قائم ہیں۔ سی ایس این میں پانچ اور آریہ کنیا ڈگری کالج میں دس جون سے فارم کی تقسیم جاری ہے جب کہ بی ڈی سی میں آٹھ یا نو جون سے فارم ملنا شروع ہوں گے۔ علاوہ ازیں وہاں مذکورہ کالجوں میں نہ تو بی اے کے درجات میں اردو مضمون کی منظوری ہے نہ ہی ایم اے کے درجات میں۔ اس بابت اردو نواز حضرات، طلبہ لیڈران، مختلف تنظیموں کے علاوہ خود طلبہ و طالبات نے بھی آواز بلند کی تھی کہ شہر کے ان کالجوں میں اردو کی تعلیم کا نظم ہونا چاہیے، لیکن برسوں سے بلند ہو رہی یہ آواز شاید حکومت کے ذمہ داروں کے کانوں تک پہنچنے سے قاصر ہے، اس لیے یہاں اس برس بھی اردو زبان کے ساتھ گریجویشن اور پی جی کرنے کے خواہاں طلبہ و طالبات کو مایوس ہونا پڑے گا۔ صورت حال یہ ہے کہ مدارس سے بنیادی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ دسویں و بارہویں بھی اردو مضمون کے ساتھ امتیازی نمبرات سے پاس کر لیتے ہیں، لیکن گریجویشن میں اردو نہ مل پانے سے ان کے مستقبل پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاہ آباد تحصیل علاقے کے کئی ڈگری کالجوں میں شاہ آباد قصبہ میں واقع پی این ڈگری کالج بھی شامل ہے جو علاقائی عوام کے لیے سابق رکن پارلیمنٹ الیاس اعظمی کا تحفہ ہے۔ یہاں کئی پروفیشنل کورس کرنے کا انتظام ہے، بی کام، بی فارما، ایل ایل بی، ایم بی اے جیسے کورس شاہ آباد کے اس کالج سے کیے جاسکتے ہیں، ساتھ ہی یہاں اردو زبان سے بی اے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح شاہ آباد تحصیل علاقے کے پہانی قصبے میں عیدگاہ روڈ پر واقع نفعا کوثر ڈگری کالج ہے جو قصبے کے نواب خاندان سے تعلق رکھنے والے علی کوثر زیدی کی کاوشوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے۔ یہاں لڑکیوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھا گیا ہے بالخصوص مسلم لڑکیوں کے لیے۔ قابل ذکر ہے کہ یہاں کے گورنمنٹ ڈگری کالج میں بھی گزشتہ کئی برسوں سے اردو زبان کی منظوری کے لیے مسلسل آوازیں اٹھ رہی ہیں لیکن تمام صدائیں بے اثر ثابت ہوئی ہیں۔

علاوہ ازیں بلگرام تحصیل میں تقریباً دو درجن سے زائد ڈگری کالج ہیں، لیکن اردو زبان سے بی اے محض ایک کالج سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ شری رام سوروپ نامی پی جی ڈگری کالج مین روڈ پر ہی واقع ہے۔ ان علاقوں کے مذکورہ کالجوں کو چھوڑ دیں تو پورے ضلع کے کسی بھی ڈگری کالج میں اردو زبان سے گریجویشن یا پوسٹ گریجویشن کرنے کا نظم نہیں ہے۔ قابل ذکر ہے کہ ضلع کے مسلم اکثریتی علاقوں کے اسکولوں میں اردو کے ساتھ دسویں اور بارہویں کر کے کالجوں میں پہنچنے والے طلبہ و طالبات کے سامنے اس وقت دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جب ان کی مجبوری زبان اردو کے بغیر ہی انھیں گریجویشن یا پی جی کرنا پڑتا ہے۔ ایسے حالات میں یا تو چاہتے ہوئے بھی طلبہ و طالبات اردو زبان سے منہ موڑ لیتے ہیں یا پھر ہردوئی سے ہجرت کر کے کسی دوسرے شہر میں حصول تعلیم کے لیے چلے جاتے ہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے اردو میڈیم کتابوں کی فروختگی

حیدرآباد (۲۱رجون)۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے اعلامیہ کے مطابق اردو اکیڈمی کی جانب سے طبع کردہ انٹرمیڈیٹ سال دوم اردو میڈیم کی ایم پی سی اور بی پی سی کی کتابیں صدر دفتر اردو اکیڈمی، حج ہاؤس نامپلی حیدرآباد اور اردو مسکن خلوت حیدرآباد میں فروخت کے لیے دستیاب ہیں۔ اضلاع کے بک سلرس خصوصی ڈسکاؤنٹ کے ساتھ کتابیں حاصل کر سکتے ہیں۔ تفصیلات کے لیے 9402211790 پر (حج ہاؤس نامپلی) اور اردو مسکن خلوت میں 9618094171 یا 040-24577868 پر ربط کریں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

رفتید ولے نہ از دل ما

نئی دہلی۔ اردو کے معروف صحافی جناب محی الدین عالمگیر کا ۸رجون ۲۰۱۴ء کو دہلی کے اسکارٹ اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین ۹رجون کو بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ عالمگیر صاحب کی طبیعت خراب ہونے پر ان کو انقلاب اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا مگر ڈاکٹروں نے ان کو اسکارٹ لے جانے کی صلاح دی جہاں انھوں نے آخری سانس لی۔ محی الدین عالمگیر ۱۹۵۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۸۰ء میں اردو صحافت سے وابستہ ہوئے اور 'آزاد ہند'، اخبار مشرق' اور 'آبشار' سے وابستہ رہے، بعد ازاں ۱۹۹۷ء میں وہ یو این آئی اردو سے منسلک ہو گئے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

○

برہانپور کے کہنہ مشق شاعر جناب امیر امیدی برہانپوری ۶رجون ۲۰۱۴ء کو اپنے وطن برہانپور میں انتقال کر گئے۔ انھیں ۷رجون کو بعد نماز ظہر سپرد خاک کیا گیا۔ امیر امیدی یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اُن کا اصل نام محمد رمضان انصاری تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا اور وہ حضرت آزاد امیدی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ مرحوم کے دو مجموعہ ہائے کلام 'عروس غزل' اور 'حرف آرزو' منظر عام پر آ کر علمی و ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اسی طرح شہدائے کربلا سے متعلق ان کا ایک مجموعہ 'حق عبودیت' بھی شائع ہوا تھا۔

امیر امیدی نے اپنے ابتدائی زمانے میں خوب جدوجہد کی جس کی عکاسی اُن کے اس شعر سے ہوتی ہے:

ہم نے اس شان سے فرصت میں کئی دن کاٹے ہیں
صدیاں سہمی ہی رہیں ہم سے کہ پل جیسے کٹے

امیر امیدی فلموں سے بھی وابستہ رہے۔ متعدد فلموں میں ان کے گیتوں نے اردو زبان اور اس کی شیرینی کا جادو جگایا۔ فلم 'چنگی بائی' کے گیت مقبول عام ہوئے۔ ٹی وی سیریل 'الف لیلیٰ' کا ٹائٹل گیت اور ٹی وی سیریل 'طلسم ہوش ربا' کا ٹائٹل گیت بھی اُن ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : گلستانِ غزل
شاعر : انجم کمار گوکل
ضخامت : ۲۰۰ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ناشر : ادیب پبلشنگ ہاؤس
9-10-241، رسالہ بازار، قدیم گولکنڈہ، حیدرآباد–۸
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmail.com

حیدرآباد چار سو سال سے اردو کے لیے جولان گاہ ثابت ہوا ہے۔ یہ شہر ہمیشہ سے اردو ادب کے لیے زرخیز رہا ہے۔ عالمی ادبیات کی تاریخ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی زبان و ادب پر کسی قوم یا مذہب کے افراد کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی اور اس کا اطلاق دنیا کی تمام زبانوں پر ہوتا ہے، خصوصاً کلاسیکی زبانوں کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بے شمار رنگ و نسل اور اقوام و مذاہب سے وابستہ انسانی گروہوں نے ان زبانوں سے وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی سرزمین میں گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار اردو زبان کی یہ خوبی رہی ہے کہ اس زبان میں شعر و ادب کی نمائندگی کرنے والوں میں مختلف اقوام و ملل کے افراد کا حصہ رہا ہے، جس سے عالمی طور پر شہرت یافتہ اس مقولہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ زبان و ادب کسی قوم یا مذہب کی میراث نہیں ہوتے۔ یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ حیدرآباد سے وابستہ فن کاروں نے اردو شعر و ادب سے دل چسپی کی انوٹ مثالیں پیش کی ہیں۔ انہی چند اہم فن کاروں میں انجم کمار گوکل کا بھی شمار ہوتا ہے جو چالیس سال سے اردو ادب کے گیسوئے نظم کو سنوارنے میں لگے ہیں۔

انجم کمار گوکل کے دو شعری مجموعے 'کاسۂ نظر' اور 'گوکل کی غزلیں' اس سے پہلے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں شناخت حاصل کر چکے ہیں۔ انجم کمار گوکل کی شاعری کئی خوبیوں کی حامل شاعری ہے۔ وہ روایتی لفظوں کے پاسدار ہیں تو جدید لفظوں میں قینچے کے روح کو داخل بھی کرتے ہیں، خیالات اور احساسات کے جذبات کی پیش کش میں صداقت ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں، ان کی شاعری میں حسن و عشق کی دل گرفتگی کے مسائل سے لے کر دنیاوی مسائل سے ٹکرانے کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں، ان کی شاعری میں سہل ممتنع کی خوبی بھی ہے۔ افکار و احساسات کے معاملے میں انجم کمار گوکل نے غزل کی روایت کا مکمل خیال رکھا ہے، لیکن الفاظ اور لفظیات کے معاملے میں وہ جدید تقاضوں کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ سے حتی المقدور گریز کیا۔

یہ ضروری تو نہیں عشق میں رسوا ہو جاؤ
تم سے ممکن ہو تو کچھ دیر مرے دل سے ملو

شام سے صبح ہوئی صبح سے پھر شام ہوئی
ختم اب تک نہ ہوئی عمر رات نہ ہوتے پائی

جب سے ٹوٹی ہے ان کی نظر سے میری نظر
گردشِ وقت رکے بھی نہ بات کیا کروں

اور ڈاکٹر فاروق شکیل کے بقول انھوں نے "غزلوں میں اپنے مضامین کی آبیاری کی ہے جو ہر دل کے ترجمان ہوتے ہیں خصوصاً ایسے دلوں کے جن میں محبت قیام کرتی ہے، اخلاص مسکراتا ہے، وفا ناز کرتی ہے اور وہ روحِ مطلق نظر آتے ہیں"۔

حیراں ہو پکاروں کس نام سے انھیں
مشہور ہیں زمانے میں میرے نام سے وہ

لب میں اپنے سے کیسے الگ کیوں گوکل
تصورات میں ہر دم جو مجھ سے گویا ہے

زندگی مسکراتی رہی رات بھر
ضبطِ غم آزماتی رہی رات بھر

آنکھ جب تک یہ تر نہیں ہوتی
زندگی معتبر نہیں ہوتی

اس کتاب کی دوسری بڑی خصوصیت ہے کہ یہ کتاب دونوں رسم الخط میں ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں الفاظ کے معانی بھی حاشیہ میں درج ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی اور ادبی حلقوں میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلائے گی۔

●❖●

نام کتاب : دستک
مصنف : فرحت علی عثمانی غوری ایڈووکیٹ
ضخامت : ۱۶۰ صفحات
قیمت : ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتا : عثمانی ہاؤس، اقبال باغ، راحت منزل کمپاؤنڈ، دودھ پور روڈ، علی گڑھ–۲۰۲۰۰۱
تبصرہ نگار : ایم رحمن
mrahmandelhi@yahoo.com

زیرِ نظر کتاب 'دستک' میں دس مضامین اور چھتیس خطوط شامل ہیں۔ دیباچہ ایم رحمن نے لکھا ہے اور پیش لفظ مصنف فرحت علی عثمانی (ایڈووکیٹ) نے۔ کتاب کا انتساب 'محترمہ والدہ صاحبہ اور والد صاحب کے نام کرتے ہیں کہ میں آج جو کچھ ہوں، ان کی کوششوں، کاوشوں اور دعاؤں کی وجہ سے ہوں'۔

'دستک' ممتاز صحافی اور ادیب کے مضامین اور خطوط کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ملک کے موقر اخبارات و رسائل مثلاً نئی دنیا، قومی آواز، راشٹریہ سہارا، انقلاب، ہمارا سماج، صحافت اور ہفت روزہ صدائے تعلیم، علی گڑھ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علمی و ادبی آستانے میں تعمیری مزاج ہے اور یہی تعمیری مزاج قوم کی ترقی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ فرحت نے اپنے مضامین و خطوط میں حیرت انگیز طور پر سماج میں سلگتے مسائل کا بہت عمدہ جائزہ لیا ہے۔ فرحت کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ یہاں نام، شہرت اور ایوارڈ پانے کی بھی کوئی ہوڑ نہیں، یہاں تو صرف خدمتِ خلق کا جذبہ ہے۔ کیوں کہ آج بدقسمتی سے ادب کی دنیا میں کوئی کسی کی پذیرائی کرنے کو آمادہ نہیں وہ تو صرف اپنی پذیرائی کے حامی دکھائی دیتے ہیں اس روش نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

فرحت علی عثمانی نے مردم خیز خطہ گنور ضلع بدایوں (یوپی) میں جناب منشی راحت علی (مرحوم) کے علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور ابتدائی تعلیم خاندانی مکتب سے حاصل کی، لیکن جوں جوں شعور پروان چڑھتا گیا ان قدم بھی بڑھتے چلے گئے۔

جہاں تک ان کی سماجی خدمات کی بات کی جائے تو ایک لمبی فہرست ہے۔ ان دنوں وہ ہندوستانی اقلیت کونسل (علی گڑھ) این جی او کے صدر کے عہدے پر فائز ہیں اور فیض عام ٹرسٹ ایجوکیشنل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے جنرل سکریٹری ہیں۔ ادبی و سماجی مسائل پر ہر سال سیمینار کا انعقاد اس بات کا ثبوت ہے کہ موصوف کس قدر متحرک ہیں۔ اسی لیے ان کا شمار ان روشن فکر دانش وروں میں ہوتا ہے جنھوں نے علمی و ملی مسائل پر بیباک اور متوازن موقف رکھتے ہوئے اپنی علاحدہ شناخت بنائی ہے۔

کتاب کے مطالعے کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہاں اسلوبِ تحریر میں فکر کی دنیا آباد ہے۔ مضامین و خطوط میں بلند حوصلگی ہے، عالی ظرفی ہے اور وضع داری بھی۔ لب و لہجے کے اعتبار سے ہم عصروں کے تقابل میں انفرادیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ موصوف نے اپنے معاشرے کے تضادات کی بے اصولی، بدعملی، اقلیت کی اقتصادی بدحالی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ ایڈووکیٹ فرحت علی عثمانی نے تلخ و شیریں حقائق پر مصلحت کی کوئی ریشمی نقاب نہیں ڈالی۔ موضوعات بھی ایسے چنے ہیں مثلاً مسلم تنظیموں کی تقسیم، کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں، ہم مسلم سماج کی سیاسی حق تلفی، گجرات میں آرٹیکل 356 کا نفاذ کیوں نہیں؟ دہشت گردی کے اسباب، کیا تقسیم ہند ناگزیر تھی؟ ایسے بہت سے سلگتے ہوئے مسائل کا جائزہ پیش کیا ہے۔

علمی ہونے کے باوجود اس کتاب سے ہر شخص مستفیض ہو سکتا ہے کیوں کہ یہ اپنے موضوع پر ایک جامع تصنیف ہے، بقول ڈاکٹر تابش مہدی:

جہانِ دل میں سناٹا بہت ہے
سمندر آج کا پیاسا بہت ہے

●❖●

بقیہ: اردو شاعری کے کچھ مشہور گھرانے

صفحہ ۳ سے آگے

تھے، انھوں نے عاشق تخلص اختیار کر رکھا تھا، ان کا مجموعۂ کلام بھی شائع ہوا تھا۔ گلزار دہلوی کے بھائی پنڈت رتن موہن زتشی خار دہلوی کے نام سے مشہور تھے۔ خار دہلوی صاحب کا کلام ان کے عہد کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوا کرتا تھا۔ میں جب منشی دیا نرائن نگم کے خطوط کا مجموعہ ترتیب دے رہا تھا تو ان کے مشہور رسالے 'زمانہ' کانپور کے مختلف شماروں میں خار دہلوی صاحب کی نظمیں اور غزلیں دیکھی تھیں۔ ان کے دو شعری مجموعے 'خلش' اور 'خارزار' شائع ہوئے لیکن اب وہ دستیاب نہیں ہیں۔ گلزار دہلوی کے چچا بھی شاعر تھے، ان کا کلام رسائل کی زینت تو بنا لیکن ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔

پروفیسر زار دہلوی کے خانوادے کے سب سے مشہور شاعر بلاشبہ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی ہوئے۔ گلزار صاحب ۷ جولائی ۱۹۲۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے آٹھ یا نو سال کی عمر سے شاعری شروع کر دی تھی، تقریباً گیارہ بارہ سال کے جب وہ ہوئے تو انھوں نے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ گلزار دہلوی صاحب اب خود ہی استادی کے درجے پر فائز ہیں۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی، نعتیہ شاعری میں بھی انھیں درک حاصل ہے، رباعی اور قطعات کہنے میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے۔ چند سال قبل ان کا ایک شعری مجموعہ 'گلزارِ غزل' کے نام سے شائع ہوا، اس کے شروع میں اردو کے مشہور شعرا اور ناقدین کی گلزار دہلوی کی شاعری کے تعلق سے رائیں شامل ہیں۔ اردو زبان گلزار دہلوی کا اوڑھنا بچھونا رہی ہے۔ اردو سے محبت ان کے خون میں رچی بسی ہے۔ انھوں نے ایسی بہت سی رباعیاں اور قطعات کہے ہیں جن میں اردو زبان سے محبت اور عقیدت کا جذبہ اپنے شباب پر ہے۔ اب آیئے ان کی کتاب 'گلزارِ غزل' سے ان کی غزلوں کے چند اشعار پر نظر ڈالیں:

عرش سے بے کسوں کی آہ بھی
لوٹ کر بے اثر نہیں آتی

لاکھ دنیا سے چھپایا تم کو نظروں سے مری
تم مگر میری غزل کے استعاروں میں رہے

مٹ مٹ کے ابھرتی رہیں قسمت کی لکیریں
ہم وقت کے ماتھے پہ شکن بن کے رہے ہیں

منزل میں اداس دل ہے گو روح بلالی ہے
احباب میرے دل کی آواز نہیں سمجھے

بلبل ہر ایک نالہ کناں ہے بہار میں
یارب اسیر قفس زاغ و زغن ہوں میں

خانوادۂ گلزار دہلوی کے شعرا میں ہم نے صرف گلزار دہلوی کے ہی اشعار پیش

گئے ہیں، علامہ زار دہلوی، عاشق دہلوی اور خار دہلوی وغیرہ کے اشعار ہم پیش نہیں کر سکے اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ مقالے کے صفحات کافی بڑھ گئے ہیں۔ یہ موضوع دراصل ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے لیکن سر دست ہم صرف مقالہ قلم بند کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں، ان شاء اللہ آئندہ اس مقالے کو کتاب کی شکل دینے پر غور کریں گے۔

اردو کے غیر مسلم شعرا میں منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کا گھرانا بھی ممتاز گھرانا ہے۔ ان کے گھرانے میں کئی نامور شعرا پیدا ہوئے۔ منور لکھنوی کے والد منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی اپنے زمانے کے جانے پہچانے شاعر تھے۔ ان کے دادا منشی پورن چند ذرہ بڑی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے اردو سماج میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے پردادا منشی الشور پرشاد شعلہ نے بھی میدانِ شاعری میں بڑا نام کمایا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انجہانی منور لکھنوی کے خاندان میں کئی پشتوں تک شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ ان کے دو چچا جو ان کے خاندان سے ہی تعلق رکھتے تھے اپنے وقت کے کامیاب شعرا میں شامل تھے۔ ان کے ایک چچا کا نام منشی رام سہائے تمنا تھا اور دوسرے چچا منشی ماتا پرشاد تمیستان کے نام سے جانے جاتے تھے۔ منور لکھنوی کے ننہیال میں اردو شاعری کا دور دورہ تھا۔ ان کے ماموں منشی جگدیش پرشاد قیصر لکھنوی نے سیکڑوں نظمیں اور غزلیں کہیں۔ وہ لکھنؤ کی بزم شعرا میں اپنا منفرد مقام رکھتے تھے۔ منور لکھنوی کی جس خاندان میں شادی ہوئی اس خاندان کے افراد بھی شعر و شاعری میں طاق تھے۔ ان کے خسر منشی لچھمن پرشاد صدر لکھنوی صاحب دیوان شاعر تھے۔ 'چمنستان سخن' ان کے کلام کے مجموعے کا نام ہے۔ 'تحفۂ صدر' اور 'صدائے منور' ان کی دوسری کتابوں کے نام ہیں۔ اس طرح یہ بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ منور لکھنوی کے خاندان، ننہیال اور سسرال میں اردو شعر و ادب کا چرچا اپنے پورے شباب پر تھا۔

جہاں تک منور لکھنوی کا سوال ہے تو ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے ہم عصروں میں ان کا شمار اردو کے کہنہ مشق اور ممتاز شعرا میں ہوتا تھا۔ منور لکھنوی نے کم عمری میں ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ سولہ سال کی عمر میں انھوں نے ایک عمدہ اور معنی خیز غزل کہی جس کے دو شعر اس طرح ہیں

مرے اعمال کی اتنی وہ سزا دیتے ہیں
میں جو مرتا ہوں تو پھر مجھ کو جلا دیتے ہیں

یہ ستم ہے یہ غضب ہے یہ شرارت ہے یہ حجاب
اور ہی ہستی فانی کا پتا دیتے ہیں

منور لکھنوی کی جس غزل کے ہم نے دو اشعار آپ کے مطالعے کے لیے پیش کیے ان کی وہ غزل رسالہ 'ترجمان' لاہور کے جولائی ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع کی گئی تھی۔ ان کے استاد نوبت رائے نظر نے منور لکھنوی کی صرف چند غزلوں پر اصلاح دینے کے بعد ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ اب انھیں کسی استاد کی ضرورت نہیں۔ ان کے شعری مجموعوں 'نوائے کفر'، 'ادائے کفر' اور 'کائنات دل' وغیرہ کا مطالعہ کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ منشی نوبت رائے نظر نے ان کے بارے میں جو انکشاف کیا تھا وہ انکشاف سو فیصد درست ثابت ہوا۔

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے طبع زاد شاعری تو کی ہی ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کچھ مشہور منظوم ترجمے بھی کیے۔ ان کے اپنے ترجموں میں بھگوت گیتا، رامائن، گیت گووند، چار دوت، گیتا نجلی، مثنوی اسرار خودی اور رباعیات عمر خیام کے تراجم شامل ہیں۔ اگر منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔

ہم نے زیر نظر مقالے میں اردو شاعری کے صرف چند مشہور گھرانوں کے ہی احوال پیش کیے ہیں، ایسے دوسرے گھرانے بھی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم نے ان گھرانوں کا ذکر کرنے سے گریز کیا ہے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اگر قسمت نے یاوری کی تو ان شاء اللہ ہم اس موضوع پر ایک مستقل کتاب پیش کریں گے۔

●●●

بقیہ: اودے پور میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ کا قیام ...

صفحہ ۸ سے آگے

شاعر اور اودے پور کی علمی و ادبی محفلوں کے روحِ رواں پروفیسر فاروق بخشی نے اپنی نہایت عمدہ تقریر میں اردو کی ترقی و فروغ کے لیے متعدد تجاویز پیش کیں جس میں ایک یہ تھی کہ انجمن کی اودے پور شاخ صوبے میں اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کی صورت حال پر ایک رپورٹ تیار کرے۔ انھوں نے اودے پور شاخ کو سرگرم و متحرک رکھنے کے لیے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اپنی صدارتی تقریر میں اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ جس بات کو وہ عرصۂ دراز سے کہہ رہے تھے اب وہ اردو دنیا میں ایک تحریک بن رہی ہے کہ اردو کی ترقی کا اہم اسکول کے نظام میں اردو کی شمولیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ انجمن کی نئی شاخوں کے قیام کے معاملے میں بہت محتاط ہیں اور صرف ان ہی لوگوں کو مختلف شہروں میں سکریٹری شپ کی ذمے داری دے رہے ہیں جو نہ صرف فعال ہیں بلکہ ممکن حد تک اردو کی سیاست سے دور ہیں۔ اودے پور میں انجمن کی روحِ رواں ڈاکٹر ثروت خاں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انھیں اودے پور کے غیر اردو داں علمی حلقوں میں بھی بے حد پسند کیا جاتا ہے اور اسی لیے وہ انجمن سے ایسے لوگوں کو بھی وابستہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں جو اصطلاحی اردو والے نہیں ہیں۔ اس موقعے پر جناب مستان چنچل نے ایک فی البدیہہ نظم موقعے کی مناسبت سے پیش کی اور محترمہ زبیدہ خان نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انجمن ترقی اردو شاخ اودے پور کے سکریٹری پروفیسر پریم سنگھ بھنڈاری کے شکریے پر یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

●●●

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

انیسویں صدی میں ادب، تاریخ اور تہذیب (صدیق الرحمٰن قدوائی کے اعزاز میں مضامین)		
	مرتبین: اطہر فاروقی، رضا حیدر، سرور الہدیٰ	۳۰۰/=
خواب ہم ساتھ سیر گل کریں گے	کشمیری لال ذاکر	۳۰۰/=
ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	۳۰۰/=
دلی کی درگاہ شاہ مرداں	خلیق انجم	۲۰۰/=
پہلا ورق (اسی کی اردو ادب سے منتخب ادب) اسلم پرویز		
	(انتخاب و ترتیب: شمس الحق عثمانی، محمد فیروز دہلوی)	۳۰۰/=
روحِ مسعود	حکیم سید ظل الرحمٰن	۲۵۰/=
ماحصل	اطہر فاروقی	۲۲۰/=
سیرت فریدیہ (سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد خاں اور دیگر افرادِ خاندان کے حالات)		
	مصنف: سرسید احمد خاں، مرتب: خلیق انجم	۱۵۰/=
ہندوستان میں اردو سیاست کی تفہیم نو	اطہر فاروقی	۲۶۰/=
انقلاب: ایک سورج ایک تہذیب کی کہانی	عابد اللہ غازی	۸۵/=
بلیک ہول (دو ہولی آوازوں کی چھٹی طویل دراما)	ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی	۱۴۰/=
دوکانِ شیشہ گراں (مضامین اور خاکے)	شمیم حنفی	۲۰۰/=
دلی کے محاورے	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۰۰/=
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا	خلیق انجم	۲۳۰/=
غالب تنقید	جاوید رحمانی	۱۱۰/=
سن ستاون کی دلی اور بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز	۱۵۰/=
آزاد ہندوستان میں اردو زبان: تعلیم اور صحافت	اطہر فاروقی	۱۴۰/=
ہندوستان میں فکری و تہذیبی اصلاح کا آغاز اور ماسٹر رام چندر		
	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۸۰/=
The Court of Indar اندر سبھا (سید آغا حسن امانت)		
	افروز تاج	۳۰۰/=
اردو ہے جس کا نام (رباعیات کا مجموعہ)	امیر چند بہار	۱۱۰/=
پریم چند گھر میں (شورانی دیوی)	مترجم: سید حسن منظر	۲۰۰/=
ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر (منیجر پانڈے)	مترجم: سرور الہدیٰ	۲۰۰/=
دلی کے مسلمان دانشور (انیسویں صدی) مصنف: مشیر الحسن		
	مترجم: مسعود الحق	۲۷۵/=
منکشف ان کہی	اطہر فاروقی	۱۵۰/=
جہانِ اقبال	عبد الرحیم خاں	۷۵/=
کرشن چندر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ (سیاسی اور سماجی پس منظر میں)		
	ڈاکٹر عبد السلام صدیقی	۸۵/=
ہم سفروں کے درمیان	شمیم حنفی	۱۵۰/=
ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری (دیوناگری)	ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی	۶۰/=
محقق غالب کالی داس گپتا رضا	محمد عارف خاں، ماہتاب صدیقی	۸۰/=
بہاری رسمیں	ڈاکٹر نریش	۸۵/=
خواجہ غلام السیدین	پروفیسر آل احمد سرور	۲۲۰/=
خواجہ غلام السیدین (مضامین اور تقریریں)	خلیق انجم	۱۰۰/=
اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۲۵۰/=
دیوانِ بیاں (احسن اللہ خاں بیانؔ)	ارجمند آرا	۱۵۰/=
نوادرِ اقبال یورپ میں	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۱۴۰/=
بھگود گیتا (اردو منظوم)	شان الحق حقی	۷۰/=
جگنوؤں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	۶۰/=

اودے پور میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ کا قیام اور افتتاحی جلسہ

راجستھان کے اسکولوں کے نظام میں اردو کی شمولیت ہی صوبے میں زبان کے فروغ کی ضامن

اودے پور کو میواڑ منطقہ میں اردو کا مرکز بنانے کی تحریک کی ضرورت: خواجہ محمد اکرام الدین



تصویر میں (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین اور ڈاکٹر اطہر فاروقی خطاب کرتے ہوئے۔ اسٹیج پر تشریف فرما ڈاکٹر ثروت خاں، پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر پریم سنگھ بھنڈاری، ڈاکٹر اطہر فاروقی اور ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخوں کے احیا کے سلسلے کے نتیجے میں راجستھان کے سرسبز و شاداب اور جھیلوں کے شہر اودے پور میں انجمن کی شاخ کا قیام ۲۲؍جون کو ژنک و احتشام کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کی صدارت میں ہوا۔ اس موقعے پر منعقد افتتاحی جلسے میں مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی بھی موجود تھے۔ راجستھان کو جغرافیائی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: میواڑ اور مارواڑ۔ اودے پور میواڑ کے منطقے میں واقع ہے۔ نہایت ہی سرسبز و شاداب جھیلوں کے شہر کے نام سے موسوم یہ شہر خوب صورت ہی نہیں بلکہ اس کے اطراف و جوانب کے دیگر شہر اور قصبات بھی اپنے حسن کی وجہ سے دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کے مرکز ہیں جس نے اس علاقے کو اقتصادی خوش حالی بھی دی ہے۔ اس اقتصادی خوش حالی سے اس علاقے کی اردو آبادی بھی فیض یاب ہوئی۔ افسوس کی بات مگر یہ ہے کہ اردو کے اداروں ہی نے نہیں بلکہ اردو اخبارات نے بھی اس علاقے کی طرف رجوع نہیں کیا جب کہ کسی بھی اردو اخبار کے لیے اس علاقے میں راجستھان کے کسی بھی دوسرے علاقے سے زیادہ گنجائشیں ہیں۔ اودے پور میں نہ تو اردو کا کوئی روزنامہ یا ہفتہ وار اخبار آتا ہے اور نہ ہی اردو کے رسائل یہاں کے بک اسٹالز پر پہنچتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی یہاں اردو پڑھنے اور اردو ادب سے لطف اندوز ہونے کا غالب رجحان ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہاں وہ لوگ بھی اردو پڑھتے اور اردو میں لکھتے ہیں اور جن کی مادری زبان نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہاں اردو مادری زبان والے کثرت سے اردو کے ساتھ ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔

اس صورت حال نے خواجہ محمد اکرام الدین کو خوش گوار حیرت میں ڈال دیا اور انھوں نے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا کہ قومی اردو کونسل جس کا مینڈیٹ ہی ہندستان میں ہر سطح پر اردو کا فروغ ہے اور جو خود مختار ایسٹ کی وہ واحد ریاستوں میں تمام تر مشکلات کے باوجود قابل ذکر کام کر رہی ہے وہ اودے پور کو اردو کے نئے مرکز کے طور پر فروغ دے گی۔ انھوں نے اودے پور میں تین سالانہ لیکچرز جس میں سے ایک موہن لال سکھاڈیا یونی ورسٹی میں محمود سعیدی کے نام سے موسوم ہوگا، کے اجرا کا اعلان کیا۔ ایک لیکچر انجمن ترقی اردو اودے پور شاخ اور ایک گورنمنٹ میرا گرلس کالج میں منعقد ہوگا۔ انھوں نے اردو خطاطی اور عربی و فارسی کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل کے مراکز کے قیام کا بھی اعلان کیا۔ جلسے میں سامعین کی بڑی تعداد نے یک زبان ہو کر خواجہ محمد اکرام الدین سے درخواست کی کہ بین الاقوامی اردو فیسٹول بھی اگر اودے پور میں ہو تو خوب ہو کیوں کہ انگریزی کا سب سے بڑا جے پور لٹریری فیسٹول بھی اسی صوبے میں ہوتا ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے اس تجویز کو اصولاً منظور کر لیا اور کہا کہ قومی اردو کونسل ہر برس کسی ایک شہر میں لٹریری فیسٹول کیا کرے گی اور کونسل پہلا لٹریری فیسٹول مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) کے اشتراک سے اس کی اودے پور شاخ کے زیر انتظام کرے گی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل اردو کتاب میلے کا بھی انعقاد کرے گی۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ دہلی جا کر اہم اخبارات کے مدیران سے بات کر کے ان سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے اخبارات کا اودے پور ڈاک اڈیشن شائع کر کے اسے اودے پور اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں پہنچانے کی کوشش کریں۔ اپنی بات ختم کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ تمام کام کرتے ہوئے اہل اودے پور کو یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہندستان میں اردو کے فروغ و ارتقا کا دارومدار اسکول کے نظام میں اردو کی تعلیم کی شمولیت پر ہے۔ انھوں نے انگریزی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ بغیر کسی کوشش کے آج انگریزی کی اجارہ داری اس لیے ہے کہ وہ نہ صرف اسکول کے نظام تعلیم میں شامل ہے بلکہ بلاشبہ انگریزی کا نظام تعلیم معیار کے اعتبار سے بہترین ہے، جس سے اردو نظام تعلیم کے پریکٹیشنرس کو سبق لینا چاہیے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اودے پور شاخ کے قیام کا یہ جلسہ ۲۲؍جون ۲۰۱۴ کو اودے پور میں منعقد ہوا جس کی صدارت مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی۔ اسٹیج پر موجود ڈاکٹر ثروت خاں، پروفیسر پریم سنگھ بھنڈاری اور پروفیسر فاروق بخشی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنے مفکرانہ خیالات سے ناظرین کو اس بات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی کہ کس طرح اردو کی ہمہ جہت ترقی ہو سکتی ہے۔

موہن لال سکھاڈیا یونی ورسٹی میں صدر شعبۂ اردو، صاحب اسلوب

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے — ادارہ

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲
قیمت فی شمارہ: ۲ روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)

Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org